22

زندگی کے تین اَدوار بچپن، جوانی اور بڑھاپا

(فرمودہ 13 جولائی 1945ء بمقام بیت الفضل ڈلہوزی)

تشہد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ہر ایک چیز کے لئے ایک عمر مقرر کی ہے اور پھر اس عمر کے کئی حصے بنائے ہیں۔ پہلے کمزوری کا دَور ہوتا ہے پھر طاقت کا دَور ہوتا ہے اور پھر ضُعف کا دَور ہوتا ہے۔ قوتِ نامیہ 1 رکھنے والی چیزیں ہمیشہ سے اِسی قانون کے ماتحت چل رہی ہیں۔ اور اگر وہ اپنی حیاتِ طبعی کے نیچے چلیں تو ان پر یہ تینوں اَدوار گزرتے ہیں۔ بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو حیاتِ طبعی کو حاصل نہیں کرتیں۔ اور بعض وجود دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی حقیقی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتے ہیں۔ جیسے انسانوں میں عورتوں کے اور دوسرے جانوروں میں ماداؤں کے حمل ضائع ہو جاتے ہیں۔ ابھی پیدا ہونے والی چیز اپنا حقیقی وجود حاصل نہیں کرتی کہ تلف ہو جاتی ہے۔ پھر بعض ایسے وجود بھی ہوتے ہیں جو حقیقی وجود حاصل کرنے کے بعد اور اپنی کامل شکل اختیار کرنے کے بعد اپنے قویٰ اور اپنی طاقتوں کو ظاہر نہیں کر سکتے۔ جیسے بعض بچے پورے حمل میں ضائع ہو جاتے ہیں یا مُردہ بچے پیدا ہو جاتے ہیں یا پیدا ہوتے ہی مر جاتے ہیں۔ پھر کچھ وجود ایسے بھی ہوتے ہیں جو کامل وجود کو حاصل کر لینے کے بعد اُن قویٰ اور طاقتوں کو ظاہر بھی کرنے لگتے ہیں جو خدا تعالیٰ نے ان کے اندر پیدا کی ہوتی ہیں۔ لیکن ابھی کمزوری ہی کا دَور ہوتا ہے کہ وہ مر جاتے ہیں۔ خواہ وہ وجود انسانوں میں سے

ہوں یا جانوروں میں سے۔ جیسا کہ بعض لوگوں کے بچے چھوٹی عمر میں فوت ہو جاتے ہیں۔ پھر کچھ وجود ایسے ہوتے ہیں جو اِس عمر سے ترقی کر کے جوانی کو پہنچتے ہیں لیکن پیشتر اس کے کہ جوانی اپنے کمال کو پہنچے وہ جوانی کے ابتدا میں یا درمیان میں ہی مر جاتے ہیں۔ لیکن کچھ طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو زندگی کے اِن تینوں دَوروں میں سے گزرتا ہے۔ یعنی بچپن سے بھی گزر جاتا ہے، جوانی سے بھی گزر جاتا ہے اور بڑھاپے کا زمانہ بھی اُس پر آتا ہے۔ اور وہ بڑھاپے میں اپنی زندگی کا کچھ حصہ جو اُس کے لئے مقدر ہوتا ہے گزارتا ہے۔ یہ تینوں دَور اپنے اندر الگ الگ رنگ رکھتے ہیں۔ اور یہ تینوں دور ایسے ہیں جو اپنے اندر خوبیاں بھی رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ کچھ خرابیاں بھی ہیں۔

بچپن کی خرابیاں ہمیشہ جہالت کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ چونکہ اِس عمر میں انسان کو علم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہا ہے اس لئے ایسی حرکات کر بیٹھتا ہے جو اُس کی ذات کے لئے بھی مُضِر ہوتی ہیں اور دوسروں کے لئے بھی۔ اِسی طرح علم نہ ہونے کی وجہ سے بسا اوقات وہ جہالت کی باتوں کو سن کر انہیں علم سمجھ لیتا ہے۔ جیسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَاَبَوَاهُ یُهَوِّدَانِهٖ اَوْ یُنَصِّرَانِهٖ اَوْ یُمَجِّسَانِهٖ۔2 یعنی بچہ تو فطرتاً اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ یہودیت، نصرانیت اور مجوسیت کی غلط باتیں اس کے کان میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اور بچپن کی وجہ سے چونکہ اُس کے اندر امتیاز کرنے کا مادہ نہیں ہوتا اِس لئے وہ ان باتوں کو قبول کر لیتا ہے۔ خواہ وہ باتیں فطرت کے خلاف ہوں، خواہ عقل کے خلاف ہوں اور خواہ دیانت کے خلاف ہوں۔ تو یہ بچپن کی کمزوری ہے۔ بچپن میں تجربہ نہیں ہوتا اور تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے بچہ غلط اور صحیح بات میں امتیاز کرنے کی قابلیت کم رکھتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی بچپن کی عمر میں بعض خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔ بچپن کی عمر کا موجودات کے ساتھ پہلا تعلق ہوتا ہے اس لئے بچے جو علم بچپن میں سیکھ سکتے ہیں وہ بڑے ہو کر نہیں سیکھ سکتے۔ اِس کا تجربہ یوں ہو سکتا ہے کہ دو آدمیوں کو لے کر شہر میں سے گزرو۔ ان میں سے ایک ایسا ہو جو اُسی جگہ پیدا ہوا ہو اور دوسرا ایسا ہو جو باہر سے آیا ہو۔ تو تم دیکھو گے کہ باہر سے آنے والا کئی ایسے سوالات کرے گا جو اُس جگہ کے رہنے والے کے دل میں کبھی پیدا نہیں ہوتے۔

کیونکہ وہ ان چیزوں کو شروع سے دیکھتا آیا ہے اور دیکھتے چلے آنے کی وجہ سے تجسس کا مادہ اس میں نہیں رہا۔ لیکن جو نیا نیا آتا ہے وہ ہر چیز کو غور سے دیکھتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ یہ اس طرح کیوں ہے؟ اِسی طرح جو لوگ بڑی عمر کے ہو جاتے ہیں وہ اس دنیا کی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں اور اپنے لمبے تجربہ کی بناء پر اور لمبے تجسس کی وجہ سے اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دنیا کی بعض چیزیں سمجھ میں آسکتی ہیں اور بعض نہیں آسکتیں۔ اور جو چیزیں اُن کی سمجھ میں نہیں آتیں اُن کے متعلق وہ خیال کر لیتے ہیں کہ یہ سمجھ میں آنے کے قابل ہی نہیں۔ حالانکہ جو چیزیں اُن کی سمجھ میں نہیں آتیں ان میں سے ایک بڑا حصہ ہوتا ہے جو دوسروں کی سمجھ میں آسکتا ہے مگر جب وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ چیزیں ہماری سمجھ میں آ ہی نہیں سکتیں تو ان کی طرف سے توجہ ہٹا لیتے اور ان کے متعلق تجسس چھوڑ دیتے ہیں۔ مگر بچے کے اندر یہ مادہ ہوتا ہے کہ جب وہ کوئی نئی چیز دیکھتا ہے تو اُس کے متعلق سوالات شروع کر دیتا ہے۔ اگر بادلوں کو دیکھتا ہے تو پوچھتا ہے کہ بادل کیا چیز ہیں؟ کیوں آتے ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ کیونکر برستے ہیں؟ غرض وہ سوالات جو ایک سائنسدان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں یا ایک حساب دان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں یا ایک تاریخ دان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہی سوالات اس بچے کے دل میں بھی پیدا ہوتے ہیں بلکہ درمیانہ درجہ کے سائنسدان، درمیانہ درجہ کے حساب دان اور درمیانہ درجہ کے تاریخ دان کے دل میں وہ سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے جو ایک بچے کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ سوالات ان کے دلوں میں اِس لئے پیدا نہیں ہوتے کہ وہ دنیا میں ایک لمبا عرصہ رہنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہوتے ہیں کہ ہر چیز جس کا وجود دنیا میں ہے ہم اس کی کُنہ اور حقیقت کو حل نہیں کر سکتے۔ لیکن بچے نے ابھی یہ سوال حل نہیں کیا ہوتا وہ سمجھتا ہے کہ میرا فرض ہے کہ میں ہر چیز کو غور سے دیکھوں اور اس کے متعلق پوچھوں۔ اِس لئے وہ ہر چیز کے متعلق سوال کرتا چلا جاتا ہے اور اُس کا دماغ بھی ان باتوں کو اخذ کرنے کے لئے زیادہ آمادہ ہوتا ہے۔ یہ کتنا بڑا فائدہ ہے۔ اگر بچپن کا زمانہ انسان پر نہ آتا، اگر بچپن کی خصوصیات نہ ہوتیں تو دنیا میں علوم کا قیام بھی نہ ہوتا کیونکہ علوم کا قیام بچپن کے ساتھ وابستہ ہے۔

پھر جوانی آتی ہے، جوانی کام کرنے کے دن ہوتے ہیں۔ ان کام کے دنوں میں انسان قسم قسم کی قربانی کرتا ہے اور قسم قسم کی جرأت کے نظارے دکھاتا ہے۔ اور اپنے عمل کے ساتھ دنیا میں تغیر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بچپن کے علوم اور بچپن کے سوالات کی وجہ سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا نے کچھ بھی نہیں کیا لیکن مَیں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جسے تجربہ نہیں ہوتا وہ یہ نتیجہ نکالا کرتا ہے کہ لوگوں نے اس کام کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں۔ اِس لئے وہ اس میں غلطی کر گئے ہیں مگر میں اِس کام کو زیادہ بہتر صورت میں کر سکتا ہوں۔ اس خیال کی وجہ سے وہ لازمی طور پر دنیا میں تغیر پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ حرکت میں برکت ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی اِس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ اور بسا اوقات اس کے ذریعہ ایسا تغیر ہوتا ہے جو دنیا کے لئے بہت ہی مفید اور دنیا کو ایک قدم آگے بڑھا دینے والا ہوتا ہے۔ اور یہ کامیابی اُس کو اُس قوتِ عملی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو بچپن نے اُس کے اندر پیدا کی۔ بچپن میں بچے کو اگر کھلونا دیا جائے تو وہ اُس کو توڑ دیتا ہے۔ وہ کھلونے کو اِس لئے توڑتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے میں اِس سے اچھا بنا سکتا ہوں۔ لیکن بوجہ بچپن کے اُس کو توڑ کر بنانے پر قادر نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ جوان ہوتا ہے اور اُس میں تخلیق کی قوت پیدا ہو جاتی ہے وہ اِس کھلونے کو بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور گو بسا اوقات وہ غلطی بھی کرتا ہے لیکن بعض اوقات کامیاب بھی ہو جاتا ہے بلکہ اُس سے بھی اچھا بنا لیتا ہے۔

مگر جہاں جوانی میں خوبیاں ہیں وہاں بعض نقائص بھی ہیں۔ کہتے ہیں جوانی دیوانی۔ انسان جوانی میں کہتا ہے کہ جو بھی میری بات کا انکار کرے اُسے مار دوں اور جو مقابلہ کرے اسے کُچل دوں۔ لیکن ایک لمبے تجربہ کے بعد وہ اِس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ انکار اور مقابلہ کرنے والے وجود بعض دفعہ بہت مخلص ثابت ہوتے ہیں۔ جوانی کہتی ہے کہ جو مقابلہ کرتا ہے اُسے مار دو، اُسے نکال دو لیکن تجربہ انسان کو بتاتا ہے کہ جنہیں وہ مارنا چاہتا ہے یا جن کو وہ نکالنا چاہتا ہے یا جن کو وہ توڑنا چاہتا ہے وہی کل کو بڑے کام کے وجود ثابت ہوں گے۔ آخر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دشمنی رکھنے والے بعد میں کتنے مخلص وجود ثابت ہوئے۔ صرف حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی ایسے تھے جن کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں

کہ تم میں سے ہر ایک نے میرا انکار کیا مگر ابو بکرؓ ایسا تھا جس میں مَیں نے کوئی کجی نہیں دیکھی۔ مگر دوسرے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادہ سے گھر سے نکلے تھے۔ اب جوانی میں انسان کے جو خیالات ہوتے ہیں اگر ان کے مطابق حضرت عمرؓ سے سلوک کیا جاتا اور فرض کرو کہ اُس وقت مسلمانوں کے پاس طاقت ہوتی اور نوجوانوں کے ہاتھوں میں کام ہوتا اور حضرت عمرؓ کو مار ڈالتے تو حضرت عمرؓ کو مارنا صرف عمرؓ کا مارنا نہ ہوتا بلکہ ساری دنیا کو مار دینے کے مترادف ہوتا۔ کیونکہ جس قسم کے تغیرات حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ہوئے اور جس قسم کا کام حضرت عمرؓ نے کیا ایسا کام دنیا میں بہت کم انسانوں نے کیا ہے۔ پس اگر یہی فیصلہ ہوتا کہ چونکہ حضرت عمرؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی ہے اِس لئے اُن کو قتل کر دیا جائے تو دنیا ایک نہایت ہی قیمتی وجود سے محروم ہو جاتی۔

اِسی طرح حضرت خالدؓ بن ولید جو اسلامی فتوحات کے بڑے بھاری موجب ہیں اور انہوں نے اسلام کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کیں اور سالہا سال تک رات دن اپنے آپ کو موت میں ڈال کر اسلام کی خدمت کی یقیناً ان کو بھی نوجوانوں کے فیصلہ کے ماتحت مار دیا جاتا۔ حضرت عمروؓ بن العاص کی موت کا فتویٰ بھی صادر کیا جاتا۔ عکرمہؓ بن ابی جہل جس نے بعد کی قربانیوں کی وجہ سے دنیا کے لئے ایثار کی ایک بہترین مثال قائم کر دی اسے بھی قتل کر دیا جاتا۔ اور اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ جنہوں نے اسلام کے لئے بڑی بڑی قربانیاں کیں اور جو اسلام کی تاریخ میں روشن ستاروں کی طرح نظر آتے ہیں اور جن پر مسلمان آج بجا طور پر فخر کرتے ہیں نہ اسلام کے لئے قربانیاں کرتے اور نہ مسلمان اِن ہستیوں پر فخر کر سکتے۔ تو جوانی میں جہاں قوتِ عملیہ پائی جاتی ہے وہاں بوجہ اِس خیال کے کہ دنیا غلطی کر رہی ہے میں اِس غلطی کو درست کروں گا۔ اور بوجہ اس کے کہ اِس درست کرنے کے ساتھ دوسرا پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ جو چیز بگڑی ہوئی ہے اُسے توڑ ڈالوں بعض نوجوان دیوانگی کی حد تک پہنچ جاتے ہیں اور دنیا کو بڑے بڑے فوائد سے محروم کر دیتے ہیں۔

اِس کے بعد بڑھاپا آتا ہے۔ بعض دفعہ بڑھاپا ایسا ہوتا ہے کہ انسان سیکھا سکھایا

سب کچھ بُھول جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔ وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۣۙ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا 3۔ اس حالت میں انسان کو کچھ علم نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں نے بعض بُڈھوں کو بچوں کی طرح روتے دیکھا ہے۔ محض اِس لئے کہ مجھے فلاں چیز نہیں ملی یا فلاں نے میری خبر گیری نہیں کی۔

مجھے یاد ہے مولوی محمد احسن صاحب امروہی مرحوم قادیان آئے اور ان سے مختلف باتیں ہوئیں۔ آخر میں انہوں نے علیحدگی میں میرے ساتھ گفتگو کی اور صاف طور پر اقرار کیا کہ وہ پوری طرح سمجھ گئے ہیں کہ راستی اور سچائی قادیان میں ہے لیکن ساتھ ہی رو پڑے اور کہا کہ میں مجبور ہوں۔ میری بیوی میری طہارت کرتی ہے اور وہی میری خدمت کرتی ہے اِس لئے میں اُس کا محتاج ہوں۔ پیغامیوں نے میرے بیوی بچوں کو لالچ دیا ہوا ہے اِس لئے وہ انہیں نہیں چھوڑتے اور میں اُن کے ساتھ جانے پر مجبور ہوں۔ اب یہ بھی بڑھاپے کی ایک مجبوری تھی۔ لیکن بڑھاپا اپنے ساتھ تجارب بھی لاتا ہے۔ بچپن اور جوانی کے تجارب کے بعد جو خلاصہ نکلتا ہے بڑھاپا اُس خلاصے کا برتن ہے۔ جیسے بھینس چارہ کھاتی ہے، اُس کو حمل ہوتا ہے، حمل سے بچہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اسکے تھنوں میں دودھ پیدا ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح وہ برتن جس میں دودھ دوہا جاتا ہے وہ بڑھاپا ہے جو تمام زندگی کا خلاصہ اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر انسان کی اعصابی طاقتیں ماری جائیں تو یہ عمر انسان کے لئے دکھ اور تکلیف کی عمر ہوتی ہے۔ لیکن اگر دماغی طاقتیں قائم رہیں اور جسمانی طاقتیں بھی ایسی کمزور نہ ہوں کہ انسان بے کار ہو جائے تو یہ عمر زندگی کے تجارب کا بہترین خلاصہ ہوتی ہے۔ جس کے بغیر دنیا صحیح طور پر آگے نہیں بڑھ سکتی۔

غرض ہر دَور اپنے اندر خوبیاں بھی رکھتا ہے اور نقائص بھی۔ جس طرح انسانی زندگی ہے اِسی طرح قومی زندگی بھی ہوتی ہے۔ جس طرح ایک فرد پیدا ہوتا ہے اِسی طرح قوم پیدا ہوتی ہے۔ اور جو اَدوار افراد پر گزرتے ہیں وہی قوموں پر بھی گزرتے ہیں۔ قومیں بھی افراد کی طرح پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہ بچوں کی طرح بچپن کی غلطیاں بھی کرتی ہیں۔ بچپن کی قسم کی بیوقوفیاں بھی کرتی ہیں اور بچوں کی طرح سوال و جواب بھی کرتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ

ہزاروں سوالات صحابہؓ کی طرف سے اور مستورات کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر کئے گئے۔ اور جب آپ نے اُن کے جوابات دیئے تو اُن کا علم ترقی کر گیا اور آنے والے لوگوں کے لئے ترقی کا ایک نیا باب کھل گیا۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ ایک یہودی حضرت عمرؓ کی مجلس میں آیا۔ اور کہنے لگا کہ ہمیں تو آپ کی شریعت پر رشک آتا ہے۔ پیشاب، پاخانہ، نہانا، دھونا، کھانا، پینا، کپڑے پہننا۔ غرض ہر چیز کا ذکر اس میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ یہ رشک اسے اُنہی سوالات کی وجہ سے پیدا ہوا جو صحابہؓ فرداً فرداً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کرتے تھے۔ اگر اُن سوالات کو الگ الگ کر کے دیکھا جائے تو بچوں کے سے سوالات معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر اُنہیں یکجائی طور پر دیکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ اگر یہ سوالات نہ ہوتے تو اسلام کی عمارت نامکمل رہ جاتی۔ اِس کے مقابلہ میں جن قوموں کی بچپن کی عمر نامکمل رہ جاتی ہے وہ احکام کی تفاصیل سے محروم رہتی ہیں۔ اور جب اُن سے اخلاقی یا تمدنی احکام کی تفصیلات کے متعلق سوال کیا جائے تو وہ کہہ دیتی ہیں کہ اس کے متعلق تو ہماری شریعت میں کچھ نہیں لکھا۔ لیکن قرآن کریم نے تمام امور پر روشنی ڈالی ہے اور کسی اہم امر کو نظر انداز نہیں کیا۔ گو تمام مضامین کی تفصیل اِس کے اندر نہیں۔ اور نہ اتنے مضامین کی تفصیل محدود صفحات میں آسکتی تھی۔ اگر قرآن کریم میں سب مضامین اِس تفصیل کے ساتھ لکھے جاتے اور ہر آدمی سب مسائل کا جواب اِسی میں سے نکال سکتا بلکہ ہر سوال اس میں حل کیا ہوا ہوتا تو قرآن کریم چار پانچ سَو صفحے کی کتاب نہ ہوتی بلکہ دس بیس لاکھ صفحے کی کتاب ہوتی اور کوئی بھی اسے پوری طرح پڑھ نہ سکتا۔ اور بجائے ہر رمضان میں پورا قرآن مجید تلاوت کر لینے کے لوگ ساری عمر پڑھتے رہتے اور پھر بھی پورا نہ پڑھ سکتے۔ کوئی پندرھویں پارے تک پہنچتا اور مر جاتا، کوئی بیسویں پارے تک پہنچتا اور مر جاتا اور کوئی ایک آدمی زیارت کے قابل ایسا نہ ملتا جس نے پورا قرآن مجید پڑھا ہوتا۔ تو عوام الناس کو فائدہ پہنچانے کے لئے ضروری تھا کہ خدائی کلام مختصر ہو اور اُس میں اشارتاً سارے علوم موجود ہوں۔ اور ان اشارات کی تفصیل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ظاہر ہو۔ یہ تفصیل اِسی صورت میں ظاہر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو یہ شوق عطا فرمایا

کہ جیسے بچہ سوال کرتا چلا جاتا ہے اور کہتا ہے اماں! یہ کیا ہے؟ وہ کیا ہے؟ اِسی طرح صحابہؓ سوال کرتے چلے جاتے تھے۔ آخر یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ 4 یعنی اے مومنو! تم ان باتوں کے متعلق سوال نہ کیا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہارے لئے تکلیف کا موجب بن جائیں۔ تو کیا اِس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ صحابہ کرامؓ کثرت سے سوال کیا کرتے تھے؟ لیکن جیسے بچہ جب سوال کرنے میں حد سے بڑھ جاتا ہے تو اُس کو روکا جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو سوالات کی زیادتی سے روکا۔ لیکن اِس بات سے پتہ لگتا ہے کہ بچپن کا زمانہ صحابہؓ پر پوری طرح آیا اور انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اموال کو خرچ کرنے کا سوال آیا تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم اسکے متعلق سب کچھ جانتے ہیں بلکہ وہ فوراً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچے اور پوچھا کہ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! ہم اپنے اموال کو کس طرح خرچ کریں؟ ساری دنیا کھانا کھاتی ہے مگر صحابہؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! کونسی چیز حلال اور کون سی حرام ہے؟ دنیا میں یتیم پائے جاتے ہیں مگر صحابہؓ کو اُن کا بھی احساس ہوا اور وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کیا کہ یتامیٰ کے بارے میں کیا احکام ہیں؟ غرض صحابہؓ سوالات پوچھتے چلے گئے۔ اور جو پوچھنے کے عادی نہ تھے وہ پوچھنے والوں کے ساتھ چمٹ گئے۔ جیسے حضرت ابوہریرہؓ خود نہیں پوچھتے تھے لیکن سارا دن مسجد میں پڑے رہتے تھے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنتے رہتے تھے۔

پھر شباب کا دَور آیا تو ہم دیکھتے ہیں کہ اِس دَور میں بھی صحابہ کرامؓ نے وہ قوتِ عملیہ دکھائی کہ دوسری اقوام میں اِس کی مثال نہیں ملتی۔ اِس چھوٹی سی قوم نے تھوڑے عرصہ میں ہی بڑی بڑی سرکش حکومتوں کو کچل کر رکھ دیا۔ عرب کی آبادی اِس وقت پچاس ساٹھ لاکھ کے قریب ہے اور میرا اندازہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عرب کی آبادی دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ دس لاکھ کے معنے یہ ہیں کہ اِتنی آبادی تھی جتنی آبادی اِس وقت لاہور شہر کی ہے۔ مگر کیا کوئی قیاس کر سکتا ہے کہ لاہور کی آبادی اُٹھے اور امریکہ کی حکومت کو یا انگلستان کی حکومت کو یا روس کی حکومت کو یا جرمنی کی حکومت کو یا جاپان کی

حکومت کو توڑ کر رکھ دے؟ بلکہ لاہور تو پھر بھی متمدن شہر ہے اور یوں سمجھو کہ جھنگ کا ضلع اُٹھ کھڑا ہو یا ڈیرہ غازیخان کے لوگ اُٹھ کھڑے ہوں اور ان کے اُٹھتے ہی روس سے خبر آرہی ہو کہ ماسکو فتح ہو گیا ہے، انگلستان سے خبر آرہی ہو کہ لندن فتح ہو گیا ہے، امریکہ سے خبر آرہی ہو کہ واشنگٹن اور نیویارک فتح ہو گیا ہے، جاپان سے خبر آرہی ہو کہ ٹوکیو فتح ہو گیا ہے۔ یہ بات کسی انسان کے وہم میں بھی نہیں آسکتی۔ اور پھر یہ کامیابی کسی لمبے عرصہ میں نہیں بلکہ ایک نہایت ہی قلیل عرصہ میں ہوئی۔ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت پونے تین سال اور حضرت عمرؓ کی خلافت کا زمانہ نو سال ہے۔ اس بارہ سال کے عرصہ میں قریباً تمام ملک فتح ہو گئے تھے۔ اور حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں کوئی ملک ایسا نہ تھا جو فتح نہ ہوا ہو۔ پس صحابہؓ پر شباب بھی آیا تو ایسا کہ دنیا اِس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

پھر بڑھاپے کا زمانہ آیا تو وہ بھی کمال کا۔ بڑھاپے کے معنے عقل اور تجربہ کے ہیں۔ عقل اور تجربے کے لحاظ سے جس طرح صحابہؓ نے حدیث کی تدوین کی یا قرآن مجید کے معارف اور اس کے نکات کو اَخذ کیا ہے کسی اَور قوم نے اتنے قریب زمانہ میں اَخذ نہیں کیا۔ اور نہ ہی کسی قوم نے اس قدر قریب زمانہ میں تصوف اور فقہ کی تدوین کی جتنے قریب زمانہ میں صحابہؓ نے کی۔ یہودیوں میں فقہ اور تصوف کی بے شک تدوین ہوئی مگر ایک ہزار سال کے بعد۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ سے چار سو سال پہلے۔ مگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اور تابعین نے ان علوم کی تدوین میں کمال کر دیا۔ تو بڑھاپا بھی آیا مگر کمال درجے کا۔ گویا صحابہؓ نے تینوں اَدوار کا اعلیٰ ترین نمونہ باقی دنیا کے لئے قائم کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی تاریخ پڑھ کر انسان کے دل پر ایسا گہرا اثر پڑتا ہے کہ کسی قوم کے حالات پڑھ کر وہ اثر محسوس نہیں ہوتا۔

اب اللہ تعالیٰ نے ہماری جماعت کو اِسی کام کے سرانجام دینے کے لئے کھڑا کیا ہے جو صحابہؓ نے کیا تھا۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارا بچپن کیسا تھا؟ اور ہماری جوانی کیسی ہے؟ اگر بچپن اچھا نہ ہو تو انسان گھبراتا ہے کہ فلاں بات نہیں پوچھی، فلاں بات باقی رہ گئی۔ لیکن اگر بچپن کمال کا ہو تو تسلی ہوتی ہے کہ ہم نے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ لیا۔

ایک روایت میں آتا ہے کہ صرف دو باتیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حل کرانی رہ گئی تھیں حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ وہ دو باتیں بھی حل ہو چکی تھیں۔ لیکن اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہؓ کے دلوں کو تسلی تھی کہ ہم نے باقی سب باتیں پوچھ لی ہیں صرف دو باتیں حل کرانی رہ گئی ہیں۔ مگر کیا کوئی دوسری قوم ایسی ہے جو یہ کہہ سکے کہ ہم نے جو کچھ پوچھنا تھا پوچھ لیا؟ کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم یہ کہہ سکتی ہے کہ ہم نے جو کچھ حل کروانا تھا کروالیا؟ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کہہ سکتی ہے کہ ہم نے جو کچھ حل کروانا تھا کروالیا؟ اگر اب ان پر کوئی سوال پڑے تو وہ اِس کے لئے عقل دَوڑاتے ہیں۔ یہ نہیں کہ خدائی کتاب کی طرف رجوع کریں اور اُس سے جواب حاصل کریں۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے دشمنوں کے خلاف یہی حربہ استعمال کیا ہے۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں کہ یہ لغو بات ہے کہ انسان اپنے پاس سے کوئی دعویٰ کرے یا کسی دعویٰ کی دلیل پیش کرے۔ بلکہ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دعویٰ بھی اُسی کتاب سے پیش کرے جسے وہ مانتا ہے۔ دلیل بھی اُسی کتاب سے دے۔ لیکن اسلام کے سوا تمہیں کوئی مذہب ایسا نظر نہیں آئے گا جو دعویٰ بھی اُسی کتاب سے پیش کرے جس کو وہ مانتا ہے اور دلیل بھی اُسی کتاب سے دے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہماری جماعت میں صحابہؓ کا رنگ پایا جاتا ہے یا نہیں اور عملی طور پر ہماری جماعت صحابہؓ سے مشابہت رکھتی ہے یا نہیں؟ مخالف تو اعتراض کیا ہی کرتا ہے لیکن ہم جو ایک دوسرے کے خیر خواہ اور مُحِب ہیں کیا ہم سمجھتے ہیں کہ ہم وہی کام کر رہے ہیں جو انبیاء علیہم السلام کی جماعتیں کیا کرتی ہیں اور جس کا اعلیٰ نمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابہؓ نے دکھایا؟ اگر دیانت داری کے ساتھ ہمارا جواب ہو "ہاں!" تو ہم سے زیادہ خوش قسمت اَور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور اگر دیانت داری سے جواب ہو۔ "نہیں" تو ہماری ذمہ داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں اور ہمیں بہت جلد اپنی اصلاح اور جماعت کی اصلاح کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور ہمیں اپنی موجودہ قربانیوں کو بہت زیادہ بڑھا دینا چاہیے۔ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جن کی زندگیاں شریف انسانوں کی طرح تو بسر ہو رہی ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا ان کی زندگی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ یا تابعین کی طرح ہو رہی ہے یا نہیں۔ مجھے جب کوئی کہتا ہے کہ فلاں شخص بڑا نیک ہے اُس سے کسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی تو وہ یہ فقرہ کہہ کر مجھے اس کے متعلق خوش کرنا چاہتا ہے۔ مگر میرا دل جل جاتا ہے کہ یہ تو ایسا ہی ذلیل درجہ ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ فلاں شخص بدمعاش نہیں۔ فلاں شخص خبیث نہیں۔ یہ بھی کوئی تعریف ہے۔ اگر کوئی آدمی بادشاہ کے دربار میں جائے اور کہے اے بادشاہ! تُو خبیث نہیں۔ اے بادشاہ! تُو بدمعاش نہیں۔ اے بادشاہ! تُو لُچّا نہیں! تو بتاؤ وہ وہاں سے انعام لے کر نکلے گا یا مار کھا کر۔

یہ چیزیں تو ساری سلبی ہیں یہ نفی کرتی ہیں اس کی خباثت کی۔ یہ نفی کرتی ہیں اس کی بدمعاشی کی۔ اور نفی تعریف نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ شریف انسان اس کو گالی سمجھتا ہے۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں احمدی ایسے ہیں جن کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ اپنے اندر وہ عیوب نہیں رکھتے جو اوباش لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر کتنے ہیں جو دین کے لئے جوش اور اخلاص رکھتے ہیں اور رات دن اُن کو یہی دُھن لگی ہوئی ہو کہ دنیا میں اسلام اور احمدیت جلد پھیلے۔ وہ لوگوں سے حُسنِ سلوک سے پیش آتے ہوں۔ کمزوروں کی مدد کرتے ہوں۔ ضعیفوں کی طاقت کا موجب بنتے ہوں۔ گرے ہوئے کو اٹھاتے ہوں۔ بیواؤں کی خبر گیری کرتے ہوں۔ اور دنیا کو یہ محسوس ہوتا ہو کہ وہ اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے فائدہ کے لئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم میں یہ بات ہو یا نہ ہو لیکن صحابہ کی زندگی میں تو ہمیں یہی نظر آتا ہے۔ پس جب تک ہم میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا اُس وقت تک ہماری جوانی صحیح معنوں میں جوانی نہیں کہلا سکتی۔ بچپن کا زمانہ گزر گیا۔ بچپن میں اگر ہم نے اپنے فرائض ادا نہیں کئے تو یہ بہت بڑا نقص تھا۔ لیکن بچپن تو گزر گیا۔ اس کے بعد اب اگر ہماری جوانی بھی بے کار جائے تو بڑھاپا بہرحال خطرہ سے خالی نہیں ہوتا۔ اور ہماری مثال اُس شخص کی سی ہوگی جس پر جوانی آنے سے پہلے ہی بڑھاپا آجائے۔

پس قوم کی جوانی کی اپنی جوانی سے بڑھ کر حفاظت کرو۔ ہم دنیا کے سامنے دعویٰ تو پیش کرتے ہیں کہ ہم دنیا کی حفاظت کے لئے آئے ہیں، ہم دنیا کو امن دینے کے لئے آئے ہیں

لیکن ہم کو دیکھنا چاہیے کہ کیا ہم اس قسم کے حالات پیدا کر رہے ہیں جن سے دنیا کو امن ملے؟ ہم کہتے تو یہ ہیں ہم دنیا میں اس لئے آئے ہیں کہ ہم غرباء کی کمزوریوں کو دور کریں اور انہیں ترقی کی راہوں پر چلائیں۔ لیکن سوچو تو کیا ہمیں غرباء کی کمزوریوں کو دور کرنے کی فکر دامنگیر رہتی ہے؟ میری نگاہ تو یہ دیکھ رہی ہے کہ صرف مرکز کے غرباء کے لئے بھی غلہ کا انتظام نہیں ہوتا۔ حالانکہ غرباء کی موجودگی میں جو فاقے کر رہے ہیں ہزاروں احمدی ایسے موجود ہیں جن کے بچے آٹے سے کھیلتے ہیں اور غرباء کے گھروں میں بچے ایک ایک لقمے کو ترس رہے ہوتے ہیں۔ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ ہماری جوانی کے ایام ایسے ہیں جن پر ہم فخر کر سکیں۔ جب تک حقیقی جوانی کے حالات پیدا نہیں ہوتے ہم فخر نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اپنے منہ سے فخر کی باتیں کریں گے تو وہ ہماری ذلت کا موجب ہوں گی۔ ہم جتنا فخر کریں گے، جتنے دعوے کریں گے وہ سب ہمارے لئے گالیاں ہوں گی، وہ ہمارے لئے جُوتیاں ہوں گی جو ہم ریشم کے رومال میں لپیٹ کر اپنے سر پر مار رہے ہوں گے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جب کوئی مرتا ہے اور اُس کے رشتہ دار اس پر نوحہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں تُو بڑا بہادر تھا، تُو بہت سخی تھا تو فرشتے اُس کو نیزے کی ہُک مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بول تُو تھا بہادر؟ پھر نیزے کی ہُک مارتے ہیں اور کہتے ہیں بول تُو تھا سخی؟ اِس کا مفہوم یہی ہے کہ انسانی فطرت اگر زندہ اور صحیح ہو تو وہ ایسی تعریفوں پر شرمندہ ہو جاتی ہے۔ ایک انسان جو لالچ اور بخل سے بھرا ہوا ہو، اگر اسے کوئی کہے کہ یہ ہمارے اَن داتا ہیں، یہ ہمارے بڑے محسن ہیں اور یہ بہت ہی سخی ہیں تو اگر اُس کی فطرت مُردہ ہو تو اَور بات ہے لیکن اگر اُس کی فطرت زندہ ہے تو اُس کا نفس یہ نہیں سمجھے گا کہ میری تعریف ہو رہی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص گھوڑے سے گِر پڑے اور لوگ کہیں کہ یہ بڑا شاہ سوار ہے تو وہ خوب سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میری تعریف نہیں کی جا رہی بلکہ مجھے طعنہ دیا جا رہا ہے۔ تو محض تقریروں سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا، محض جوش و خروش ظاہر کرنے سے کچھ نہیں بنتا جب تک ہم حقیقی طور پر تبلیغ کی طرف متوجہ نہ ہوں، جب تک ہم حقیقی طور پر سوچ سمجھ کر کام نہ کریں، جب تک ہم حقیقی طور پر غریبوں کی فکر نہ کریں، جب تک ہم حقیقی طور پر بنی نوع انسان

کے اندر امن پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تب تک ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہماری قوم جوانی کے دن دیکھ رہی ہے۔ اگر اسلام ترقی نہیں کر رہا اور ہماری کوششوں کے باوجود دنیا میں اس رنگ میں مساوات پیدا نہیں ہو رہی جس رنگ میں اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جوانی سے پہلے ہم پر بڑھاپا آگیا ہے۔

پس جماعت کو اپنی عملی حالت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ وقت سُرعت کے ساتھ گزر رہا ہے اور کئی کام ایسے ہیں جو ابھی تک روزِ اول میں سے گزر رہے ہیں۔"

(الفضل مورخہ 23 ستمبر 1959ء)

1: قوتِ نامیہ: بڑھنے والی قوت

2: بخاری کتاب الجَنَائز باب مَا قِيْلَ فِی اَوْلَادِ الْمُشْرِكِيْنَ

3: الحج:6

4: المائدہ: 102